KitaabPoint.blogspot.com

کے گزر جانے کے بعد گھر کی صورت سدا خراب ہی رہی۔ سب چیزیں الٹ پلٹ تھیں' گھر اجاڑ اجاڑ سا۔ مجو بھائی کے یہاں ہونے سے تنہائی کے احساس نے تو کبھی نہیں ستایا۔ مگر مجو بھائی کی موجودگی گھر کی صفائی اور سلیقہ کی ضامن تو نہیں بن سکتی تھی۔

"صاحب جی۔"

کتابوں کی گرد صاف کرتے کرتے میں ٹھٹھکا۔ "ہاں' کیا بات ہے۔"

"صاحب جی' ذری پتہ کر یاؤں کہ میت کدوں اٹھے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر جلدی آ جانا۔"

"بس جی گیا اور آیا۔ پتہ چل جاوے پھر کھانا کھلا کر فرصت سے جاوں گا۔ میت کو کندھا تو دینا ہی ہے جی۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"نعمت خاں باہر نکل گیا۔ میں پھر کتابوں کی جھاڑ پونچھ میں لگ گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک مصروف رہا۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ہوش اس وقت آیا جب مجو بھائی نے آ کر شور مچایا۔"

"نعمت خاں' او بھائی نعمت خاں عالی۔ کہاں ہے یار۔ یاں آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔"

"اچھا تو آپ گئے۔"

"بہت ہنگامہ ہے۔ حالات کچھ خراب ہوتے ہی نظر آ رہے ہیں....... مگر نعمت خاں کہاں ہے۔"

"وہ بھی آپ کے بعد چلا گیا۔"

"وہ کس خوشی میں گیا۔"

"جس خوشی میں آپ گئے تھے۔ کہتا تھا کہ میت کے اٹھنے کا وقت معلوم کر آؤں۔"

"میت کے اٹھنے کے وقت سے اسے کیا لینا ہے۔"

"میت کو کندھا دے گا یعنی کہ شہید کی میت کو کندھا دے کر ثواب کمائے گا۔"

"پھر ہمیں اس کی میت کو کندھا دینا نہ پڑ جائے۔"

ویسے مجو بھائی کا اندیشہ صحیح نکلا۔ حالات واقعی کچھ زیادہ ہی بگڑ گئے اور دن ڈھلتے ڈھلتے کرفیو لگ گیا۔ اب مجو بھائی نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا۔ "آج کی رات مشکل ہے۔"

KitaabPoint.blogspot.com

''وہ کیوں؟''

''خطرہ ہے۔''

''کس بات کا؟''

''حملہ کا۔''

''حملہ کا؟ کس حملہ کا۔''

''یار بحث مت کیا کرو۔ تمہیں تو کچھ پتہ ہے نہیں۔ میں نے کچھ سونگھا ہے تب کہہ رہا ہوں۔''

''اچھا پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''رات کو سونا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آج رات پورا علاقہ جاگے گا۔ بہت خطرہ ہے۔''

''اچھا یہ بات ہے تو جاگ لیں گے۔''

''ہاں یار رتجگا کریں گے۔ چائے ملتی رہے' پھر جاگنا کونسا مشکل کام ہے۔'' پھر نعمت خاں کو آواز دی۔ ''نعمت خاں۔''

نعمت لپک کر آیا ''ہاں جی۔''

''رات پہرہ دینا ہے۔ تمہیں پتہ ہے نا' کرفیو لگ گیا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں''

''ہاں جی۔''

''چائے کا انتظام ہے نا؟''

''ہاں جی' وہ تو ہے۔''

یہ بھی خوب ہوا کہ مجو بھائی نے خود ہی رتجگے کا شوشہ چھوڑا اور خود ہی سویرے سے چادر تان کر سو گئے۔ تو وہ سنا رہے تھے اور پہریداری کا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر آ پڑا تھا۔ مگر خیر مجھے کونسی نیند آ رہی تھی۔ نیند کا تو ان گھڑیوں میں میرے یہاں کوسوں پتہ نہیں تھا۔ کتاب کتنی دیر تک پڑھتا رہتا۔ تھک کر کتاب ایک طرف رکھی۔ انگڑائی لے کر اٹھا اور بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ عجب منظر تھا۔ وہ سڑک جو رات بھر چلتی تھی اور جہاں تہاں پان سگریٹ اور چائے کی دکانیں کھلی رہنے سے جاگ باگ رہتی تھی یہاں سے وہاں تک خالی تھی اور خاموش۔ اتنے ہنگامے کے بعد اتنی خاموشی۔ میں حیران بھی ہوا اور خوفزدہ بھی۔ ویسے رات کو خاموشی بنفسہ میرے لئے کوئی نیا تجربہ تو نہیں تھی۔ اس شہر کی زندگی سے بہت پہلے میں اس تجربے سے گزر چکا تھا۔ بلکہ یہ تجربہ تو میرے بچپن کی یادوں کا حصہ ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

میں نے اس زمانے میں آنکھ کھولی تھی جب ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ہماری اس چھوٹی سی بستی میں بجلی اس وقت تک نہیں پہنچی تھی۔ رات وہاں کتنی جلدی شروع ہو جاتی تھی اور کتنی لمبی اور کالی ہوتی تھی۔ کالی رات کا سناٹا گہرا ہوتا ہے۔ دھرم شالا کے اس پار سے آتی ہوئی گیدڑوں کی آوازیں اس سناٹے کو توڑتی نہیں تھیں' اور گہرائی پیدا کر دیتی تھیں۔

اس کے بعد جو سناٹا میرے تجربے کا حصہ بنا وہ 1947ء کے آس پاس کے زمانے کا ہے۔ اب میں شہری مخلوق بن چکا تھا۔ تعلیم کی تقریب سے مجھے شہر میں آ کر رہنا ہی تھا۔ اور شہروں کا نقشہ ان دنوں عجب تھا۔ اچھی بھلی گہما گہمی ہے۔ دکانیں کھلی ہیں۔ خریداروں کے جمگھٹے' دنگی بازوں کے قہقہے' خوانچہ والوں کی بولیاں' یکا یک پراسرار طور پر کوئی خبر' کوئی افواہ بازار سے اس نکڑ سے اس نکڑ تک بجلی کی تیزی سے پھیلتی چلی جاتی۔ اسی تیزی سے دکانیں بند ہوتی چلی جاتیں۔ شٹر دھاڑ دھاڑ گر رہے ہیں۔ دروازے دھڑا دھڑ بند ہو رہے ہیں۔ دکاندار دکانیں بند کر کے' خریدار سودا سمیٹ کے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ دم کے دم میں بازار بند' سڑکیں خالی' فضا سنسان' جیسے وہ افواہ نہیں تھی' کوہ ندا سے آواز سنائی دی تھی۔

ویسا ہی سناٹا مگر ایک نئی دہشت کے ساتھ۔ ہر عہد اپنا سناٹا' اپنی دہشت اور ہاں اپنا تشدد اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اندھیرے کے ساتھ سناٹے کا رنگ اور ہوتا ہے۔ مگر یہاں کھمبے اپنی روشنیوں کے ساتھ سب اپنی اپنی جگہ سلامت تھے سڑک پر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر کسی وجود کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ یا اللہ اس راہ پر امنڈی ہوئی خلقت دم کے دم میں کس کھوہ میں جا چھپی۔ بھگدڑ' دھکم پیل' دھوں دھا' ہائے وائے' سب غائب' یہ کوئی نعرہ نہ کوئی چیخ' نہ بند ہوتے دروازوں اور گرتے شٹروں کا شور۔ بجلی کی روشنی میں خالی اور خاموش سڑک۔ بس جہاں تہاں پڑے ہوئے ادھ جلے ٹائر' اینٹ' پتھر اور وہ بس جو جل پھنک کر کالی کھڑنک بن گئی تھی۔ آدم کے نام بس وہ سپاہی جو روشن چوراہے کے بیچوں بیچ کلاشنکوف سے مسلح ساکت کھڑا تھا۔ کتنی دیر تک میں اسے دیکھا کیا۔ حیران کہ وہ جیتا جاگتا آدمی ہے۔ یا آدمی کا پتلا جو یہاں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ تب وہ ورطہ حیرت میں غرق ہوا۔ دہشت سے پتا پانی ہوا۔ ناگاہ ایک مرد بزرگ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ لپک کر قریب گیا اور یوں عرض پرداز ہوا کہ اے صاحب کچھ بتایئے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ آنکھ کا دھوکا ہے کہ یہ کوئی قریہ بلا ہے۔ جب میں نے اس بستی میں قدم رکھا تھا تو کٹورا بجتا تھا' کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کوچوں میں چہل پہل تھی' رونق چہار طرف تھی۔ بالاخانے روشن تھے' مہوشوں کے جمگھٹے تھے' طبلے تال کھنکتے تھے۔ نظر باز اہلے گہلے پھرتے تھے۔ بالانشینوں سے نگاہ بازیاں کرتے تھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو رونقیں غائب' ہو کا عالم' چار سو دہشت کا ڈیرا ہے۔ ویرانی کا بسیرا ہے۔ کچھ نہیں کھلتا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ دبدا میں ہوں کہ کیا کروں' کدھر جاؤں۔ یہ سن اس بزرگ نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اس رنگ سے کہ ایک آنکھ ہنستی

KitaabPoint.blogspot.com

تھی' دوسری آنکھ روتی تھی۔ پھر بصد افسوس یوں کہا کہ اے جوان' مجھے تیری جوانی پہ رحم آتا ہے۔ ارے کمبخت اب یہ شہر قریہ بلا ہے۔ کس ستمگر نے تجھے یہ رستہ دکھایا ہے' مشکل میں تجھے پھنسایا ہے۔ میری مان' شتابی سے یاں سے نکل جا۔ بزرگ کا یہ کلام سن وہ رویا اور بولا کہ تقدیر نے یہ دن دکھایا ہے۔ فلک نے مجھے مشکل میں پھنسایا ہے۔ مگر اب راہ فرار کیسے اختیار کروں کہ یہ بات غیرت سے دور ہے' بندہ اس امر میں مجبور ہے۔

''ابے یار' تیرا دماغ چل گیا ہے' مرنے کی نیت ہے کیا۔ گولی پوچھ کر نہیں آتی۔ اندر آ جا۔''

مجو بھائی جاگ پڑے تھے اور لیٹے لیٹے چلا رہے تھے۔ میں بالکونی سے سرک کر واپس کمرے میں آ گیا۔ وہاں ٹھہرنے کا اب فائدہ بھی کیا تھا۔ مجو بھائی کی چیخ پکار سے سناٹے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ میں۔

''استاد' وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے۔''

''بس دیکھ رہا تھا۔''

''دیکھ رہا تھا؟ دیکھنے کو اس وقت وہاں ہے کیا۔ کرفیو لگ گیا ہے۔ اب تو چڑیا کا بچہ بھی سڑک پر نظر نہیں آ سکتا۔''

''سناٹا دیکھ رہا تھا۔''

''خوب۔'' مجو بھائی تلخی سے بولے۔ ''تم اس سناٹے کو تماشا سمجھ رہے ہو۔ گھر میں بیٹھے ہونا۔ مجھ سے پوچھو شہر کا کیا حال ہے۔ شکر کرو کہ اپنی جان بچا کر لے آیا ورنہ تم میری لاش کو اس وقت ڈھونڈ رہے ہوتے۔ یار نعمت خاں' جاگ رہا ہے نا تو۔''

''ہاں جی۔''

''تو پھر چائے کا ایک دور ہو جائے۔ کرفیو کی رات چائے کے زور ہی پر کاٹی جا سکتی ہے۔''

''اچھا جی۔''

نعمت خاں کے چلے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک ہم دونوں ہی چپ رہے۔ مجو بھائی شاید ابھی نیند کے خمار سے پوری طرح نہیں نکلے تھے۔ پوری طرح تو چائے کی پیالی ہی انہیں اس خمار سے نکال سکتی تھی۔ ادھر میرے اندر جو روچل رہی تھی اس سے میں پوری طرح نہیں نکلا تھا۔ بولا بھی تو اسی رو میں ''مجو بھائی' اس شہر میں یہ کیا ہو رہا ہے۔''

''کیا ہو رہا ہے۔'' مجو بھائی نے لاپرواہی سے کہا۔

''یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔''

KitaabPoint.blogspot.com

مجو بھائی جیسے نیند کے خمار سے نکل آئے ہوں۔ مجھے گھور کے دیکھا اور بولے ''جو ہو رہا ہے وہ کچھ نیا تو نہیں ہو رہا۔'' رکے پھر بولے ''یار میں نے تم سے ایک بات کہی تھی۔ تم نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔''

''وہ کیا بات تھی؟''

''یہی کہ اس شہر میں رہنا ہے تو سوچنا چھوڑ دو ورنہ شہر چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہم اسے روک سکتے ہیں۔ پھر سوچنے اور کڑھنے کا فائدہ؟''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ میں اس شہر میں کیا کر رہا ہوں۔''

مجو بھائی ہنسے۔ ''میں اس شہر میں کیا کر رہا ہوں۔'' میرے بیان کو اپنے طنزیہ لہجہ میں دہرایا۔ پھر کہنے لگے ''تم کہیں اور بھی ہوتے تو کیا کرتے۔ جہاں تم گئے تھے اور جہاں تمہیں کچھ کر دکھانے کا موقعہ ملا تھا وہاں تم نے کیا کیا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے مگر.....'' پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

مجو بھائی نے الجھ کر میرا فقرہ پورا ہونے سے پہلے اسے بیچ میں کاٹ دیا۔ ''مگر وگر کچھ نہیں۔ ہماری اگر مگر بے اثر ہے۔ سومت بولو۔ دیکھتے رہو۔ اسی میں خیریت ہے۔''

''اچھا' یہاں خیریت کی کوئی صورت ہے۔ آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے ہم کسی محفوظ گوشے میں بیٹھے ہیں۔ جیسے جو کچھ ہو رہا ہے ہم سے دور ہوتا رہے گا۔ ہم اپنے گھونسلے میں بچے بیٹھے رہیں گے۔''

''بچنے کا معاملہ تو جوادمیاں یہ ہے کہ قسمت والا ہی بچے گا۔ اور اپنی کوشش اور احتیاط سے نہیں بچے گا۔ جو مر رہے ہیں الل ٹپ مر رہے ہیں۔ جو بچے گا اللہ توکلی بچے گا۔ اور یار مرنے جینے کی ویسے بھی کونسی منطق ہوتی ہے۔ اور ہم لوگ تو یونہی ایک مہمل زندگی گزار رہے ہیں۔''

''اگر یہ بات ہے تو آپ مجھے کس خوشی میں احتیاط برتنے کی تلقین فرما رہے تھے۔''

''اماں اپنی طرف سے تو احتیاط برتنی چاہئے۔ آگے جو ہو سو ہو۔ ہونی کو تو نہ تم روک سکتے ہو اور نہ میں روک سکتا ہوں۔''

اتنے میں نعمت خان نے چائے لا کر سامنے رکھ دی۔ اب مجو بھائی کی جان میں جان آئی۔ پہلے ہی گھونٹ کے ساتھ پھریری لی اور بولے ''تم سے بھی زیادہ متفکر اپنے آقا حسن رہتے ہیں۔ جب دیکھو فکرمند۔ شہر کے اندیشے میں دبلے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے' بھائی مجید الحسینی' تمہیں آگے کیا نظر آتا ہے۔ میں نے کہا' سمندر' میرا منہ تکنے لگے۔ سمجھے کہ مخول کر رہا ہوں۔ کہنے

KitaabPoint.blogspot.com

لگے' مجو بھائی مجید الحسینی' میں نے سنجیدگی ہی سے کہا ہے۔ چپ ہی تو ہو گئے۔"

اور اب میں بھی چپ تھا۔ کیا کہتا' مجو بھائی نے میری بات اس طرح کاٹی کہ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔

"مجو بھائی۔" آخر میں نے زبان کھولی" مجھے اپنی بڑی بھابی کی ایک بات رہ رہ کر یاد آتی ہے۔"

"وہ کیا بات ہے۔"

"ہمارے ایک کزن ہیں پیارے میاں۔ جب ہمارے میاں جان کی آنکھ بند ہو گئی تو انہوں نے ایک ہماری جدی حویلی کو چھوڑ کر ساری جائیداد اونے پونے بکوا دی اور اپنے حصے کی بلکہ اپنے حصے سے زیادہ ایک موٹی رقم لے کر پاکستان آ گئے۔ مگر ساری رقم کھا پی کر اڑا دی۔ پاکستان میں وہ جم نہیں پائے۔ اس کے بعد ہندوستان گئے تو اپنا احوال بیان کرتے ہوئے کہنے لگے' بڑی بھابی' آپ کی بددعا مجھے لے بیٹھی۔ بڑی بھابی بولیں' بھیا ہم نے تمہیں کوئی بددعا نہیں دی۔ مگر ہمارے بددعا نہ دینے سے کیا ہوتا ہے۔ زمین کو اجاڑو گے تو زمین تو کوسے گی۔ زمین کے کوسے آباد نہیں ہوا کرتے....."

"ہاں' یہ سوچنے والی بات ہے۔" مجو بھائی اب واقعی سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"مجو بھائی' مجھے لگتا ہے کہ اس کا اطلاق خالی پیارے میاں پر نہیں ہوتا..... اور کسی پر ہو یا نہ ہو مجھ پر ہوتا ہے۔"

"میں نے تم سے کیا کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا۔"

"تمہیں یاد ہونا چاہئے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ آدمی یا تو سفر نہ کرے۔ اور کرے تو سفر کو بیچ میں نہ چھوڑے۔ تم نے سفر کا کشٹ بھی اٹھایا اور اسے پایہ تکمیل تک بھی نہیں پہنچایا۔ تم سفر کو ادھورا چھوڑ آئے ہو۔ یہ آدھ چھوٹا سفر تمہیں ستائے گا۔ اور پیارے میرا خیال ہے کہ اس نے تمہیں ستانا شروع کر دیا ہے۔"

"شاید۔"

"شاید نہیں۔ یقیناً' پیارے ابھی تو تمہیں اپنی بڑی بھابی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی ہے۔ ابھی کسی اور کی کہی ہوئی باتیں بھی یاد آئیں گی۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی نے جماہی لی" یار نیند آ رہی ہے۔"

"چائے کے بعد بھی نیند آ رہی ہے۔"

"ہاں واقعی تعجب ہے۔ چائے کے زور پر تو میں پوری رات آنکھوں میں کاٹ سکتا ہوں۔ پتہ نہیں آج کیا بات ہے مگر تم جاگ

KitaabPoint.blogspot.com

رہے ہونا۔"

"میری تو نیند ہی جیسے غائب ہوگئی ہو۔"

"بس پھر جاگو۔ میں سوتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے مجو بھائی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر بیٹھے تھے پھر دراز ہو گئے۔ اور کمال ہے فوراً ہی خراٹے بھی لینے لگے۔

میری آنکھوں میں نیند دور دور نہیں تھی۔ ذہن میں ایک دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ حیرانی اور پریشانی کہ اچھا یہ وہی شہر ہے۔ اتنا بدل گیا۔ شہر اس طرح بھی بدلتے ہیں جیسے کایا کلپ ہوگئی ہو۔ شاد آباد گہما گہمی چہل پہل اور پھر جیسے پورا شہر منقلب ہو گیا ہو۔ یہ تو واقعی وہی بات ہوگئی جو میں اس روز مجو بھائی کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ اور اچانک ایک وسوسہ میرے اندر پیدا ہوا۔ جیسے آس پاس کہیں کوہ ندا ہے۔ اب تک کہاں چھپا ہوا تھا۔ اب کیسے نمودار ہو گیا۔ سو یوں ہوا کہ جب مہینہ گزرا اور وہ تاریخ آئی تو پھر اسی ساعت وہی کچھ ہوا۔ وہ حیران کہ آواز کیسی ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ لوگ کیوں سراسیمہ ہیں۔ کیوں سب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ہے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں اور کیوں جو ہے وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ سب کچھ بھول بھال اپنے گھر کی طرف دوڑا جاتا ہے۔ وہ ایسا سوچتا تھا کہ ناگاہ ایک سمت سے ایک جوان آتا دکھائی دیا اس رنگ سے کہ پٹخیاں کھاتا ہے مگر دوڑا چلا جاتا ہے۔ پیچھے اس کے ایک پیرزن گریہ کرتی دوڑ رہی ہے اور چلا رہی ہے میرے بیٹے میرے بیٹے اس نے چاہا کہ بڑھ کر اس جوان کو دبوچے اور اسے ملامت کرے کہ کیوں اپنی ضعیف ماں کو پریشان کرتا ہے۔ پر وہ جوان اس کی گرفت سے نکلا مچھلی کی مثال تڑپا اور سمت اس کوہ کے دوڑتا چلا گیا۔ وہ بھی اس کے تعاقب میں اس کے پیچھے چلا۔ مگر دم کے دم میں وہ کوہ کے بیچ جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب وہ افسردہ و پژمردہ پلٹا۔ سوچا کہ اس ضعیفہ کو دلاسا دے۔ پر اس نے دیکھا کہ وہ پیرزن اب وہاں نہیں ہے۔ اثر آثار اس دہشت کے مٹ چکے تھے۔ پھر وہی اژدھام مجمع خاص و عام ہزاری بزاری زوروں پر دکانداری جوہری صراف بزاز گل فروش عطر فروش سب چاق و چوبند بیٹھے ہوئے خریداروں سے منہ مانگی قیمتیں وصول کرتے ہوئے۔ کٹورا بجتا ہے۔ کوچہ طبلہ عطار بنا ہے۔ یہ دیکھ وہ مزید حیران ہوا اور دہشت مزید اس پہ طاری ہوئی۔ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ کیا تھا یہ کیا ہے۔ جوان آنکھوں نے دیکھا اور دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت ہے یا توہم کا کارخانہ۔

"..... آدمی یا تو سفر نہ کرے۔ کرے تو بیچ میں نہ چھوڑے..... یہ آدھ چھوٹا سفر تمہیں ستائے گا..... اور پیارے میرا

KitaabPoint.blogspot.com

خیال ہے کہ ....." اور ایک مرتبہ میں پھر بکل ہو گیا۔ مگر مجھے کل کہاں آئی تھی۔ مجو بھائی نے بات ہی کچھ اس طرح کی تھی۔ یوں تو یہی بات وہ مختلف لفظوں میں بار بار پہلے بھی کہہ چکے تھے۔ مگر وہی ایک بات ہوتی ہے کہ یوں آپ پر اثر نہیں کرتی۔ مگر کوئی کوئی گھڑی ایسی ہوتی ہے اور کچھ اس طرح کہی جاتی ہے کہ وہ بات اندر اتر کر نہ جانے کونسے تار کو چھو لیتی ہے کہ اندر کھلبلی مچ جاتی ہے۔ اس سناٹی رات کی جانے وہ کونسی گھڑی تھی' شاید رات کا بیچ یا شاید پچھلا پہر ہو جب مجو بھائی نے وہ فقرے کچھ اس طرح کہے کہ پھر میں نہ صرف اس رات نہ سو سکا' اس کے بعد بھی ان فقروں کو اس ساری بات کو اپنے ذہن سے دفع نہیں کر سکا۔ ایک بے کلی نے مجھے آ لیا۔ اور واقعی اس سفر نے مجھے ستانا شروع کر دیا۔ باتیں یاد آنی شروع ہو گئیں' کوئی یہاں سے کوئی وہاں سے۔ کوئی آدھ چھوٹا فقرہ' کوئی محض اشارہ۔ اور میری بے کلی بڑھتی چلی گئی۔ ٹھیک کہا تھا مجو بھائی نے کہ پیارے ابھی تو تمہیں بڑی بھابی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی ہے۔ آگے دیکھنا کہ کس کس کی کہی ہوئی بات..... وہ وقت آ گیا تھا اور میں نرغے میں تھا۔

ایسے تو اپنے آپ کو بہنے نہیں دینا چاہئے۔ چل بچل ہو جاؤ گے۔ تو میں نے اپنے آپ کو سنبھالا' نرغے سے نکالا۔ بظاہر بڑے معروضی انداز میں اس سفر کا ایسے جائزہ لینا شروع کیا جیسے میں نے سفر نہ کیا ہو' کوئی نظم لکھی ہو اور اب میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہوں کہ اس میں کیا سقم رہ گیا کہ ایک کامیاب نظم نہ بن سکی یا بنتے بنتے رہ گئی۔ ویسے اس سفر کا خیال تو مجھے کچھ اسی طرح آندھی دھاندی آیا تھا۔ جیسے کسی شاعر کو اچانک کوئی نیا مضمون سوجھ جائے اور اسے بیتاب کر دے۔ پھر جب تک اسے وہ کسی شعری پیکر میں نہ ڈھال لے اسے قرار نہیں آتا۔ بس بیٹھے بیٹھے سفر کا سودا اچھلا۔ اٹھتے بیٹھے وہی ایک خیال کہ مجھے ایک بار وہاں جانا چاہئے۔ پھر اس سفر سے مجھے مفر نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ میں نے یہ سفر نہ کیا تو خفقان ہو جائے گا۔ اس وقت واقعی مجو بھائی نے مجھ پہ بڑا احسان کیا کہ ہمت بندھائی' ویزا دلوایا' اور سفر کا سارا انتظام کیا۔ بس جیسے بچے کو انگلی پکڑ کر رستے پہ ڈال دیا جائے کہ جاؤ اس راہ پر سیدھے چلے جاؤ۔ اور اب انہیں کی تلخ و تند تنقید مجھے یہ جائزہ لینے پہ مجبور کر رہی تھی کہ سقم کہاں رہ گیا۔ اور مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ وہی ہوا ہے جو اس ناپختہ عامل کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو جلالی وظیفہ پڑھنے تو بیٹھ جاتا ہے مگر آخری مرحلہ میں جب وظیفہ پورا ہونے کو ہوتا ہے گڑبڑا جاتا ہے۔ استاد جہاں سے تم بھاگ کھڑے ہوئے وہیں سے تو اس سفر کو معنی ملنے شروع ہوئے تھے۔ شعر میں' افسانے میں' سفر میں کوئی موڑ ایسا آتا ہے کہ مسافر کے لئے مطلب یہ کہ جو بھی تجربہ ہے اس تجربے سے گزرنے والے کے لئے وہ موڑ ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ چیلنج کو قبول کر لیا' اس سے نبٹنے کی ٹھان لی تو تجربے کی کوئی نہ کوئی شکل نکل آتی ہے۔ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے تو دم کے دم میں ساری ریاضت پر پانی پھر جاتا ہے۔ مجو بھائی نے ٹھیک کہا تھا کہ جہاں تم سمجھ رہے تھے کہ بات ختم ہو گئی اور تم اکھڑ گئے وہ تو بات کا آغاز تھا۔

KitaabPoint.blogspot.com

اب سانپ تو نکل چکا تھا۔ میں بیٹھا لکیر پیٹ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھ سے کوتاہی کیا ہوئی اور اس سفر کا جو میں نے اتنے شوق سے کیا تھا مطلب کیا نکلا۔ اب تو اس سفر میں مجھے کھانچے ہی کھانچے نظر آ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ تو سارا سفر ہی میری عجلت اور بے صبرے پن کا' بلکہ یوں کہئے کہ میرے انگھڑ پن کا شکار ہو گیا۔ فوری ردعمل کو قطعی اور آخری بات سمجھ لینا یہ کہاں کی عقلمندی تھی۔ اور پھر ترنت بھاگ کھڑے ہونا' وہاں ٹھہر کے کیا کرتا۔ اے واہ سبحان اللہ یہاں آ کے کیا کر رہے ہو۔ صحیح کہا مجو بھائی نے واقعی یہاں آ کے میں نے کیا کیا۔ اور یہاں میرے کرنے کے لئے تھا کیا۔ کلاشنکوف مجھ سے چلانی آتی نہ تھی۔

تو اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ تو سارا سفر ہی اکارت گیا۔ میری عجلت نے کئے دھرے پہ پانی پھیر دیا۔ اتنے زمانے بعد اس دیار کے درشن ہوئے تھے۔ اتنی جلدی وہ زمین اپنا آپا کیسے دکھا دیتی۔ درمیان میں اجنبیت کا پردہ حائل ہو چکا تھا۔ آخر پہچانتے پہچانتے ہی پہچانتی۔ پھر زمین روٹھ بھی تو جاتی ہے اور زمین اگر روٹھ جائے تو اسے منانے میں وقت لگتا ہے۔ کمبخت پتھر بن جاتی ہے۔ پھر آسانی سے موم نہیں ہوتی۔ تو ابھی تو وہ مجھے پہچان رہی تھی۔ کچھ کچھ پہچانا تھا کہ بیچ میں کھنڈت پڑ گئی۔ اور اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ سب سے پہلے مجھے کس نے پہچانا۔ درختوں نے' ویسے سب سے پہلے تو درخت ہی پہچانتے ہیں۔ پھر پرندے' پھر در و دیوار' آدمی لوگ تو کہیں بعد میں پہچانتے ہیں۔ شاید سب سے بعد میں۔ درختوں میں برگد کی بات نہیں کر رہا۔ اس کی بات الگ ہے۔ وہ تو سب سے الگ تھلگ' دیو نما زمانے سے بے نیاز کھڑا رہتا ہے۔ کوئی آئے کوئی جائے دھیان ہی نہیں دیتا۔ اس سے رشتہ پیدا کرنے کے لئے آدمی کو بہت ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ پھل دینے والے درخت شاید آدمی کو جلدی پہچانتے ہیں۔ وہی جلدی ناخوش بھی ہوتے ہیں' وہی جلدی خوش بھی ہو جاتے ہیں۔ پھلوں کے لین دین میں اچھے برے بہت سے معاملات ہوتے ہیں۔ کبھی اچھا سلوک' کبھی بدسلوکی۔ بس اسی میں ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں نے یہاں ایک عمر گزاری تھی' وہ عمر جب پیڑوں کے ساتھ سو طرح کے معاملات ہوتے ہیں۔ کچے ادھ کچرے پھل توڑ توڑ کر تو خیر انہیں ستایا ہی جاتا ہے۔ کسی چڑیا کا گھونسلہ کسی شاخ پر ہو تو اس تک پہنچنے کے لئے بھی انہیں بے آرام کیا جاتا ہے۔ ہاتھ میں غلیل ہو اور اس کی شاخوں میں بیٹھے پرندے پھل کتر رہے ہوں تو ان پرندوں کے ساتھ اس درخت کی بھی شامت آتی ہے۔ یہ سارے ہی کوتک میں ان کے ساتھ کر چکا تھا۔ سو اس بھلے وقت میں ان کے ساتھ جو ایک رشتہ قائم ہوا تھا وہ کوئی کچا رشتہ نہیں تھا۔ وقت اس رشتے کا کچھ نہیں بگاڑ پایا۔ انہوں نے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ ابھی تو میں گاڑی ہی میں تھا۔ چلتی گاڑی میں انہوں نے میری ایک جھلک اور پہچان لیا۔ بس ہبڑ دبڑ گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ تو درختوں کا معاملہ تو الگ ہے۔ مگر دوسرے لوگ بھی مجھے رفتہ رفتہ پہچان ہی رہے تھے۔ میمونہ کی آنکھوں میں شروع میں کتنی اجنبیت تھی۔ پھر ہولے

KitaabPoint.blogspot.com

ہولے وہ کتنی اپنائیت برتنے لگی تھی۔ اس صبح ساون کا جھکا لگا تھا تو اس نے کتنے چاؤ کے ساتھ کڑھائی چڑھائی تھی۔ دیکھا کہ گھٹائیں امنڈ رہی ہیں' بارش تلی کھڑی ہے۔ سکول سے چھٹی کر کے لپک جھپک آئی' بیسن گھولا اور چولہے پہ بیٹھ گئی۔ کڑھائی میں تیل کڑاکڑایا اور پھلکیاں تلنی شروع کر دیں۔ یہ کس کی خاطر ہو رہی تھی۔ تو دھیرے دھیرے غیریت کے پردے اٹھتے جا رہے تھے۔ وقت ہی ابھی کتنا گزرا تھا۔ اس زمین پر قدم رکھ کر بس ابھی سانس ہی تو لیا تھا۔ ہنوز حیرت و مسرت کا عالم تھا۔ کسی کو پہچانا کسی کو نہ پہچانا۔ کسی کے بتائے بغیر کسی کو پہچان لیتا تو حیرت ہوتی کہ اچھا میں نے اسے پہچان لیا اور پھر خوشی ہوتی۔ کتنی چیزیں ابھی آدھ پہچانی تھیں۔ کچھ مانوس کچھ نامانوس۔ تو میں ابھی پہچان رہا تھا۔ بچھڑے ہوؤں کو' ان کے بیچ اپنے آپ کو۔ بڑی بھابی بہت جلد باز نکلیں۔

اصل میں عجلت میں بڑی بھابی تھیں' میں نہیں۔ بہر حال سفر ادھورا رہ گیا۔ ابھی کتنی چیزیں دیکھی تھیں۔ اور کتنے اپنے پرایوں سے ملا تھا۔ جن چیزوں کو دیکھا تھا انہیں بھی کتنا دیکھا تھا۔ ابھی تو آنکھیں کھلنی شروع ہوئی تھیں۔ اور جن سے ملا تھا ان سے بھی ابھی کتنا مل پایا تھا۔ سب سے زیادہ افسوس خیرل بھائی کے سلسلہ میں تھا۔ ان سے ملاقات کتنی ادھوری رہی۔ سب ملاقاتیں ادھوری رہ گئیں۔ سفر تھا بھی تو بہت مختصر۔ خیر مختصر تو اسے میں نے کیا۔ مگر کمال ہے اب پھیلتا جا رہا تھا۔ جتنا یاد کرتا تھا۔ تفصیلات تو اب یاد آ رہی تھیں۔ جس تفصیل کو ہاتھ لگایا دیکھتے دیکھتے قطرے سے دریا بن گئی' بالکل منوجی کی مچھلی کی طرح کہ شروع میں چھنگلیا کے برابر تھی۔ پھر اتنی لمبی ہوئی اتنی پھیلی کہ گنگا ندی میں بھی نہیں سما پائی۔ یاد کا بھی کوئی انت نہیں ہوتا۔ ایک یاد کے اندر سے ایک اور یاد برآمد ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر سے پھر کوئی یاد نکل آتی ہے۔ یادوں کی ایک لڑی سی بن جاتی ہے اور لڑی لمبی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور یوں دیکھو تو ہم زندگی میں یاد ہی کتنا رکھتے ہیں۔ کتنا کچھ بھول جاتے ہیں۔ حافظہ کی بھی تو اپنی کوتاہیاں ہیں۔ اسی کے اندر ایک طاق نسیاں بھی ہوتا ہے۔ بہت کچھ تو اس طاق کی نذر ہو جاتا ہے۔ بچتا کیا ہے' بس جیسے سمندر میں سے چند قطرے یا موسلا دھار بارش میں سے پتوں پر ٹکی رہ جانے والی چند بوندیں۔ ویسے آدمی کی روح کو شرابور کرنے کے لئے تو چند بوندیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک عجب مصیبت پیدا ہو گئی تھی بس بوند برابر بات یاد رہ گئی۔ پھر بوند پھیل کر ندی بنتی چلی گئی۔ اس چھوٹی سی یاد کے پیچھے کوئی اور یاد چھپی ہوئی نکلی۔ اور اس چھپی ہوئی یاد کے پیچھے پھر کوئی یاد جیسے گڑمڑی مارے پڑی ہو۔ اس طرح یادوں کے دل بادل بن جاتے اور امنڈ گھمنڈ تصور میں چھا جاتے۔ ہاں ایک اور مشکل تھی۔ یادوں کے اندر سے پگڈنڈیاں نکلتیں کوئی بھی پگڈنڈی پھیل کر لمبا پیچ در پیچ رستہ بن جاتی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کن کن جنگلوں کی طرف جا رہی ہے۔ زمانے زمینیں اس میں لپٹتے چلے جاتے۔ اور اس کے باوجود یہ احساس ستاتا رہتا کہ بیچ میں سے کچھ بھول گیا ہوں۔ جب میں نے دلکشا' کے خرابے میں قدم رکھا تھا اس وقت بھی اسی طرح ہوا تھا۔ وہاں قدم

KitaabPoint.blogspot.com

رکھتے ہی مجھے کتنا کچھ یاد آ گیا تھا۔ میں اس وقت یہی سمجھا تھا کہ مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ مگر بعد میں احساس ہوا اور مستقل یہ احساس ستاتا رہا کہ بیچ میں سے کچھ بھول گیا ہوں۔ اور اب جب میں اس سفر کو یاد کر رہا تھا تو پھر وہی صورت درپیش تھی۔ کتنی تفصیلات اب یاد آ رہی تھیں۔ اس کے باوجود یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ بیچ میں سے کچھ رہ گیا' کوئی بات تھی کہ ذہن سے اتر گئی ہے۔ یا شاید مجو بھائی جس طرح مجھے کرید رہے تھے۔ اس نے مجھے اس وہم میں ڈال دیا۔

''استاد' تم ہم سے کچھ چھپا رہے ہو۔''

''نہیں مجو بھائی' جو بھی اور جتنی بھی بات تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی۔''

''پیارے' ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ اور پھر جتنا تم نے بیان کیا ہے خود اس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ بیچ میں کوئی اور بات بھی ہوئی ہے۔ وہ تم گول کر گئے۔''

''اپنی طرف سے تو میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ اب نادانستہ بیچ میں سے کوئی بات رہ گئی ہو تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''نادانستہ ہی سہی' مگر بیان بتا رہا ہے کہ درمیان میں کچھ اور بھی ہوا ہے۔ میری ساری دلچسپی اسی میں ہے۔''

''یہ تو بڑی مشکل ہے۔ اگر واقعی بیچ میں سے کوئی بات رہ گئی ہے تو وہ اب مجھے یاد نہیں۔''

''کوشش کرو' یاد آ جائے گی۔ پوری بات کا پتہ چلنا چاہئے۔''

اور میری سادگی دیکھو یا مجو بھائی پر اعتبار کہ انہوں نے اگر محسوس کیا ہے تو ایسا ہی ہوگا اور میں نے سچ مچ کوشش شروع کر دی۔ کوشش کہ جو بات بیچ میں رہ گئی ہے وہ یاد آ جائے۔ اسی کوشش میں اس پورے سفر کو میں نے اپنے اندر دہرا ڈالا۔ مگر ہوا کیا۔ بس کچھ اسی قسم کا قصہ ہوا کہ آپ کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈنے کے لئے کمرے میں بھرے سارے سامان کو ٹٹول ڈالیں۔ وہ چیز نہ ملے مگر اس چکر میں اور کتنی چیزیں جن کے بارے میں گمان بھی نہ ہو کہ وہ اپنے پاس ہوں گی برآمد ہو جائیں۔ اور اب مجھے احساس ہوا کہ یہ سفر تو اور ہی طرح کا تھا۔ جتنا اور جیسا میں سمجھ رہا تھا۔ اس سے بہت بڑھ کر۔ عجب بات تھی' اب تک مجھے اس کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ اپنے سرسری حساب سے سمجھ رہا تھا کہ سفر ادھورا رہ گیا۔ کچھ دنوں اور قیام کرنا چاہئے تھا کہ اب جو تشنگی کا احساس ہو رہا ہے وہ نہ ہوتا اور جن سے ملاقات ادھوری رہ گئی وہ بھرپور ہوتی اور میمونہ..... خیر میمونہ کا معاملہ ہاں اسے بھی دوبارہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تو خیر اب جو میں نے اپنے تصور میں اس سفر کو دہرایا تو وہ کچھ سے کچھ بن چکا تھا۔ سفر کے اندر سفر' جیسے یہ کوئی ایک سفر نہ ہو۔ اور ہر سفر ایسا جیسے اس

KitaabPoint.blogspot.com

کا کوئی انت ہی نہ ہو۔ بس جیسے سفر پر نکلا ہوں اور تھوڑی منزلیں طے کر کے کبھی تھک کر' کبھی ڈر کر' کبھی جھک کر واپس۔ تو اب مجھے زیادہ افسوس نے ستایا کہ سفر ادھورا کیوں رہا۔ اگر یہ سفر پورا ہو جاتا۔ اور پھر مجھے اس ناپخت عامل کا خیال آ گیا جو جلالی وظیفہ پڑھنے کا حوصلہ تو کر بیٹھا مگر کہیں بیچ میں پہنچ کر جھجک گیا۔

''یار جواد' تم بالکل چونگھٹ ہو۔ پہلے مرحلہ میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ تھوڑا انتظار تو کیا ہوتا' جہاں اتنے دن رکے تھے چند دن اور رکتے' دیکھتے کہ پردہ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ اماں' تم تو ہتھیلی پہ سرسوں جما رہے تھے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے۔ بہت انتظار کھینچنا پڑتا ہے' تب جا کر.....''

''مجو بھائی۔'' میں نے بے چین ہو کر ان کی بات کو کاٹا ''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اب انتظار کھینچنے کی تو اپنی عمر نہیں ہے۔''

''پھر وہی چونگھٹوں والی بات' یہاں عمر بیچ میں کہاں سے آ گئی۔''

''مجو بھائی' عمر بہت ظالم ہوتی ہے۔ اس سے بچ کر آدمی کہاں جا سکتا ہے۔ اسے تو بیچ میں آنا ہی آنا۔''

''ہوں' اب تم کوئی نہ کوئی عذر تو تراشو گے۔''

ہاں شاید یہ عذر تراشنے ہی کی کوشش ہو۔ آدمی جب رہ جاتا ہے تو عذر تو تراشتا ہے۔ مگر ایسی کوشش کا فائدہ کیا ہوتا ہے۔ خیر فائدہ تو اب مجو بھائی کی طنز و تعریض کا بھی کوئی نہیں تھا۔ لکیر پیٹنے والی بات تھی۔ اصل میں مجھے تو افسوس اس کا تھا کہ اتنے شوق سے یہ سفر کیا تھا کہ اسے سفر شوق کہنا چاہئے اور وہ کھوٹا ہو گیا۔ اتنے زمانے بعد اس دیار میں گیا' اس دیار میں جس کے در و دیوار' جس کے شجر و حجر' جس کی ہوا' جس کی چڑیاں کب سے مجھے پکار رہی تھیں' نہیں' میرے اندر سے مجھے اکسا رہی تھیں' اس طرف دھکیل رہی تھیں' مگر وہاں جا کر مت ماری گئی۔ ہر ملاقات ادھوری ہر سیر تشنہ' اور تو اور شنکر جس کے یہاں جا کر ٹھہرا تھا۔ کیا کہتا ہو گا وہ بھلا آدمی کہ اتنے ذوق و شوق سے مجھے اپنے آنے کی اطلاع دی' وعدہ کیا کہ تمہارا مہمان بنوں گا۔ اور تھوڑا ٹھہر کر رفو چکر ہو گیا' مڑ کر پھر دیکھا ہی نہیں۔ خیر دوست ہی تو ہے' خط لکھ کر معذرت کروں گا' منا لوں گا۔ اور میمونہ' خیر اس کی بات تو جانے دو۔ اسی نے تو مجھے اکھاڑا تھا۔ تو وہ ملاقات ادھوری رہی تو اس کی وجہ..... خیر' ہاں اپنے خیرل بھائی' ان سے ملاقات تو بہت ہی تشنہ رہی۔ کھلے ہی نہیں' ایک دو ملاقاتیں ہوتیں تو پھر شاید کھلتے۔ ویسے بھی خیرل بھائی تو رتجگے کے آدمی ہیں۔ ان سے ملاقات راتیں مانگتی تھی۔ یہاں ایک رات بھی میسر نہیں آئی کہ ان سے رتجگا ہوتا کہ اپنی کہتا ان کی سنتا۔ خیرل بھائی ہمیشہ رتجگے میں کھلا کرتے تھے۔ رات بھیگتی جا رہی ہے' چائے چل رہی ہے۔ ایک پیالی' دوسری پیالی' تیسری پیالی' خیرل بھائی چائے کتنی پیتے تھے۔ پہلے ہی نوٹس دے دیتے کہ دوستو' یہ پہلی کیتلی تو ساجھے کی کیتلی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اس سے ہم سب مل کر پئیں گے۔ مگر ایک کیتلی میرے لئے ڈھانک کر الگ رکھ دو۔ اور اصل گفتگو اس دوسری کیتلی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوتی۔ رات جب ڈھلنے لگتی اور اس کیتلی کی تلچھٹ سچائے کی آخری پیالی تیار ہو کر حلق میں اتر رہی ہوتی تو خیرل بھائی اپنے عروج پر ہوتے' جیسے اب اپنے اصلی رنگ پہ آئے ہوں۔

خیرل بھائی اپنی زمانے میں یعنی ابھی جب وہ ایک سینئر طالب علم کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے تو ہم سب نوجوانوں کے قبلہ و کعبہ بنے ہوئے تھے۔ میرے تو آئیڈیل تھے۔ اکیلے میرے تھوڑا ہی۔ کتنے طالب علموں نے' پڑھے لکھے نوجوانوں نے انہیں اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ کھدر پوش مگر سج دھج میں منفرد' یارا کٹھے ہیں اور خیرل بھائی رواں ہیں اور اب جیسے ٹھنٹھ پہ الو۔ صندلی نہ ہوتی تو اکیلے تھے۔ بھائی بہن' بھانجے بھتیجے سب پاکستان میں۔ اچھے عہدوں پہ فائز' آل اولاد کے ساتھ خوش وخرم' ادھر میرٹھ کی اس پتلی گلی میں بھائیں بھائیں کرتا جہاں ایسا مکان' زنان خانے میں بیوہ بہن کا اکیلا دم' مردانے میں خیرل بھائی' ہمدم ودم ساز ایک بلی' زندگی بھی خوب رنگ دکھاتی ہے۔ ایک وقت میں کیسا میلہ لگتا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ میلہ سدا جما رہے گا۔ مگر دیکھتے دیکھتے زمانہ کس طرح رنگ بدلتا ہے۔ میلہ برہم یاروں چہیتوں کی ٹکڑی تتر بتر۔ گہما گہمی ختم۔ چاروں طرف ہو حق کوئی ایک دم ٹٹروں ٹوں ٹھئے پہ لکارہ جاتا ہے۔ کہیں بعد میں پتہ چلتا ہے کہ بس وہی سچا تھا۔ میں اٹھنے لگا تو صندلی جو نہ جانے کس وقت پھر آ کر خیرل بھائی کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ جھرجھری لے کر کھڑی ہو گئی۔ ادھر میرے اندر اچانک ایک جھرجھری دوڑ گئی۔ بس یوں لگا کہ وہ ابھی اپنے پچھلے دو پنجوں پہ کھڑی ہو گی اور اتنی لمبی ہو جائے گی کہ مجھ سے..... اور اب اس گھڑی کا تصور کرتے ہوئے اچانک میرے اندر ایک بجلی سی کوندی' اچھا یہ تو وہ بلی تھی۔ مگر یہاں کہاں سے آ گئی۔ وہ تو اشبیلیہ میں تھی۔ ابوالحجاج یوسف شبر بولی بھی خوب بزرگ تھے۔ دنیا جہان سے بے تعلق' مراقبہ میں بیٹھے ہوئے۔ ان در و دیوار کے بیچ ایک عمر گزار دی حتیٰ کہ پلکیں تک سفید ہو گئیں۔ آنکھ اٹھا کر یہ نہ دیکھا کہ صحن میں کنوئیں کے متصل کھجور کا ایک درخت کھڑا ہے۔ مگر اپنی کالی بلی سے یہ الفت'..... ارے ہاں وہ تو کالی بلی تھی'..... ہاں تو الفت کہ گود میں بٹھائے رکھتے۔ اور ابوالحجاج کی وہ بلی بھی خوب تھی کہ کوئی دوسرا مجال ہے کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لے۔ شیخ کی گود میں پڑی غرغر کرتی رہتی یا پھر سوتی رہتی۔ اولیاء صوفیاء کو پہچانتی تھی۔ کوئی دنیا دار آتا تو اسے دیکھ کر غراتی' کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ کوئی پہنچا ہوا بزرگ وارد ہوتا تو دونوں پنجوں پہ کھڑے ہو کر بغل گیر ہوتی۔ شیخ ابوجعفر عریانی جس گھڑی اس آستانے پر پہنچے بلی شیخ کی گود سے اٹھ کر برابر والی کوٹھری میں گئی ہوئی تھی۔ اس نے فضا میں کچھ سونگھا۔ لپک کر واپس آئی۔ شیخ عریانی کے چہرہ مبارک کو غور سے دیکھا۔ پھر دونوں پنجوں پہ کھڑے ہو کر آغوش وا کی اور شیخ سے بغل گیر ہوئی۔ ابوالحجاج فرمایا کرتے تھے کہ نو واردوں کو میں کیا جانوں۔ میری

KitaabPoint.blogspot.com

بلی مجھے بتاتی ہے کہ کون نیک ہے کون بد ہے۔تو اب میں سمجھا۔ساتھ میں حیران بھی ہوا۔اور ہاں افسوس بھی ہو رہا تھا۔اس وقت میں نے اطمینان کا سانس لیا۔مگر اب محرومی کا احساس ہو رہا تھا کہ جیسے شیخ شبر بولی کی بلی سے بغل گیری کا شرف حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا۔پھر خیرل بھائی کو میں بھول گیا۔ان کی بلی میرے تصور میں گھر کرتی چلی گئی۔اس بلی نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔خود بھی پہنچی ہوئی لگتی تھی۔بات یہ ہے کہ سب بلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔اور ہر بلی خالی بلی نہیں ہوتی۔ان دنوں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔بس بلی کو دیکھا اور میرے ہاتھ میں کھجلی ہونی شروع ہوئی۔فوراً اینٹ اٹھاتا اور نشانہ تاک کر مارتا۔مگر فوراً ہی پھوپھی اماں کی ڈانٹ پڑتی ہے۔"بیٹے" میں نے کتنی مرتبہ تجھ سے کہا ہے کہ بلی کو مت مارا کر۔مجھے شک آوے ہے۔مگر تیرے کان پہ تو جوں ہی نہیں رینگتی۔"

"ارے بیٹے ان بلیوں کا پتہ نہیں ہوتا کہ کون بلی کیا ہے۔اور خاص طور پہ کالی بلی۔اس پہ تو کبھی ہاتھ اٹھانا ہی نہیں چاہئے۔"

"پھوپھی اماں' کالی بلی کو کیا ہوتا ہے۔"

"اب یہ تو پتہ نہیں کہ کالی بلی کے ساتھ کیا بھید لگا ہوا ہے۔ہم تو بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں۔مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک مٹی کالی بلی نے دودھ میں منہ ڈال دیا۔میں نے غصے میں آ کے اسے ڈنڈا مار دیا۔اے بھیا' وہ تو پھر ایسی غائب ہوئی کہ دکھائی نہیں دی۔پر تین دن وہ میرے خواب میں آتی رہی۔پھر میں نے یہ کیا کہ تین مرتبہ قل پڑھ کر اور ارد گرد پھونک مار کے سوئی۔پھر اس نے میرا پیچھا چھوڑا۔"

مگر خیرل بھائی کی بلی تو صندلی رنگ کی تھی۔پھر بھی میں اسے دیکھتے ہی شک میں پڑ گیا۔خیرل بھائی تو خیر ہمارے جانے بوجھے تھے مگر ان کی بلی جیسے اس کے گرد کوئی بھید منڈلا رہا ہو۔مگر ان کے لئے تو وہ جیسے سب عزیزوں دوستوں کا اگلی پچھلی صحبتوں کا نعم البدل تھی۔سب کو رخصت کر کے اطمینان اور کس وقار کے ساتھ اس بلی کے سنگ اپنی ٹھیک پہ بیٹھے تھے۔اس وقت تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔بس چکرا کر رہ گیا تھا۔اب اچانک کتنا کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔میرٹھ کی وہ اجڑی پجڑی اندھی گلی اب میرے لئے اندھی گلی نہیں تھی۔جاتے جاتے وہ کس دیار میں جا نکلی۔اور اس پہنچی ہوئی بلی نے بھی مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا..... اور جب ابن حبیب تندور سے نکلا گرم گرم نان تناول کر چکا تو عبداللہ نان فروش سے کٹورا لے کر کچے گھڑے سے انڈیل کر ٹھنڈا پانی پیا۔یہ کچھ کر کے رب کریم کا شکر ادا کیا اور پھر کچھ سوچ کر رویا۔کتنے دنوں سے وہ ہجوم درد غریبی میں گھرا اس اجنبی دیار میں آوارہ پریشان پھرتا تھا۔جہاں کیسی روکھی پھیکی کھانے کو مل جاتی کھا لیتا اور پڑا رہتا۔آج دنوں بعد اس نے اپنے تئیں ایسے گوشے میں پایا جہاں اس کے سر پہ چھت کا سایہ

KitaabPoint.blogspot.com

تھا اور برابر میں تندور روشن تھا۔ جس کی حرارت نے اسے گرمی پہنچائی اور اس کے اندر سنکتے نانوں کی سوندھی مہک نے اس کی مشام جاں کو معطر کیا۔ پھر عبداللہ نان فروش نے جس نے صورت اس کی دیکھ کر اس کی پریشاں حالی کا اندازہ لگایا تھا۔ ایک گرم گرم تندوری نان اور ایک پیالہ سالن کا اس کے روبرو رکھا اور کمال محبت سے اسے دعوت طعام دی۔ جب وہ سیر ہو کر کھا چکا تو بچھڑے ہوؤں کو جنہیں وہ اب تک اپنی پریشانی میں یاد نہیں کر سکا تھا۔ شدت سے یاد کیا اور پھر گریہ کیا۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر عبداللہ نان فروش اس کی دل جوئی کرتے ہوئے یہ بولا کہ ''اے مرد اجنبی کہ تیری پریشان حالی اور درماندگی پہلے ہی تیرے بشرے سے عیاں تھی۔ پر میں چپ تھا۔ اب تو رویا تو میرا جگر کٹ گیا۔ اب مجھ پر لازم آتا ہے کہ تجھ سے تیرا احوال پوچھوں۔ میرے عزیز' دل حال کہنے سے ہلکا ہوتا ہے اور سنے والے کو اگر وہ صاحب دل ہے غم بٹانے کا موقعہ میسر آتا ہے۔ سو بیان کر کہ تو کس دیس کی مٹی ہے۔

تب ابن حبیب نے اپنے تئیں سنبھالا اور بعد تامل کے یوں گویا ہوا کہ ''اے میرے غمگسار' کہنے کو تو یہ خانہ برباد مالقہ سے اجڑ کر آیا ہے اور اس تیرے دیار میں بے گھر بے در پھرتا ہے۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ خانہ بربادی کچھ اس سیاہ بخت کے لئے نیا واقعہ نہیں۔ نسلوں سے یہ ہمارے قبیلہ کا مقدر چلی آتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ یہ خانہ خراب اصل میں اس اجڑے دیار کی مٹی ہے جسے خلقت اشبیلیہ کے نام سے جانتی ہے۔ ایسا نگر چشم فلک نے کبھی کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ دھوم اس کی روم سے تا شام تھی۔ علماء و حکماء کہ اس دیار میں مسند نشین تھے ارسطاطالیس اور جالینوس سے بڑھ کر تھے کہ بغداد تک میں علم و حکمت کا ان کے لوہا مانا جاتا تھا۔ اس شاد آباد دیار میں ہمارے جدا کبر ابوالحجاج شیخ یوسف شبر بولی یوں اپنی مسند ولایت پہ بیٹھے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ' شہرہ ان کی کرامتوں کا دیار و امصار میں تھا۔ عمر اس بزرگ نے لمبی پائی کہ سو برس اس عالم فانی میں گزارے۔ مگر ان سے زیادہ عمر ان کی بلی نے پائی کہ جب اشبیلیہ خالی ہو رہا تھا وہ اس دار فنا میں موجود تھی۔ بعد میں اس پر کیا گزری اور کب اور کیسے اس نے داعی اجل کو لبیک کہا' اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

بارے اس بلی کا کچھ بیاں ہو جائے۔ جاننا چاہئے کہ وہ گربہ سیاہ تھی' پر روشن ضمیروں سے الفت رکھتی تھی۔ دنیاداروں پر غراتی تھی' اہل اللہ سے بصد محبت بغل گیر ہوتی تھی' ہمارے جد اعلیٰ کی چہیتی تھی۔ گود میں ان کے لیٹی رہتی تھی۔ جب شیخ کا دم واپسیں آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ ہمارے بعد جو بلی کہے وہ کرنا۔ یہ کلمہ کہہ کر وہ تو اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ یہاں وہ نیک پاک بلی لاش کے قریب دھی دے کر بیٹھ گئی۔ جو قریب آتا اس پر غراتی۔ کسی کو قریب پھٹکنے نہ دیتی۔ یہ خبر شیخ عریانی تک گئی۔ وہ بزرگ کلمہ کا ورد کرتے وارد ہوئے۔ انہیں دیکھ کر وہ روشن قلب گربہ سیاہ کہ اب الم کی تصویر بنی ہوئی تھی مودب اپنے دونوں پنجوں پر کھڑی ہوئی۔

KitaabPoint.blogspot.com

شیخ سے گلے مل کر روئی اور مئودبانہ پیچھے ہٹ گئی۔ شیخ نے ہمارے جدامجد کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور اشبیلیہ کے بڑے مدفن میں جا کر انہیں قبر میں اتارا۔ گربہ سیاہ نے پھر اسی مزار مبارک کو اپنا مسکن جانا کہ شب و روز اس کے وہیں بسر ہوتے تھے۔

سنا میں نے اپنے جد سے اور اس جد نے سنا اپنے جد سے۔ جو قرزند دلبند تھے ابوالحجاج شیخ یوسف کے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ مضطرب ہو کر مزار سے اٹھتی اور اس کاشانے پر آ کر گریہ کرتی جو پہلے شیخ کا مسکن تھا اور جہاں اب ان کا فرزند پورے خاندان سمیت رہائش پذیر تھا۔ رات بھر گریہ کرتی اور گھر کی پاسبانی کرتی۔ صبح ہونے پر واپس مزار پر چلی جاتی کچھ نہ کھلا کہ کہ یہ کیا اسرار ہے۔ عقدہ اس وقت کھلا جب نصرانیوں نے اس شہر پر دھاوا بولا۔ یہ حملہ اشبیلیہ پر بھاری پڑا۔ المعتمد اپنی شاعری اور شمشیر کے ساتھ پہلے ہی اس دیار سے بصد حسرت و یاس رخصت ہو چکا تھا۔ اور رنج اسیری کھینچ کر اس کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ اب اشبیلیہ کے باقی فرزندوں کی باری تھی جن کی تلواروں کو زنگ لگ چکا تھا۔ قیامت کی گھڑی تھی۔ اشبیلیہ اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ تلوار کے دھنی ایک ایک کر کے سب ہی کھیت ہو گئے۔ میرے جد کا پدر بھی اس معرکہ میں کام آیا۔ تب سراسیمہ خلقت گھروں سے نکلی اور جس کے جدھر سینگ سمائے ادھر نکل گیا۔ اے عزیز باتمیز' میں نے سنا اپنے جد سے اور اس نے سنا اپنے جد سے کہ اس ہنگام ہماری بزرگ گربہ سیاہ جدامجد کے مزار پرانوار سے اٹھ کر آئی اور بصد گریہ میرے جد کے جد سے بغل گیر ہوئی۔ اس سے اس بزرگ نے یہ اشارہ لیا کہ یہ شیخ کی روح پرفتوح کی طرف سے رخصتی کی ہدایت ہے۔ سو اس نے بادل نخواستہ پورے قبیلہ کو سمیٹا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گربہ سیاہ سوا دشہر تک ساتھ ساتھ آئی۔ پھر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ میرے جد کے جد سے ایک مرتبہ پھر بغل گیر ہوئی۔ اور گریہ کرتی ہوئی واپس مزار پرانوار کی طرف چلی گئی۔ راویوں سے روایت ہے کہ اس کے بعد اشبیلیہ خلقت سے بالکل خالی ہو گیا۔ تین دن تک یہ صورت رہی کہ خالی ڈھنڈھار شہر میں بس ایک کالی بلی روتی پھرتی تھی۔

نکلنے والے صرف اشبیلیہ سے نہیں نکلے تھے۔ وہ اندلس سے بھی نکل جانا چاہتے تھے۔ مگر میرے جد کے جد کی نیت تھی کہ اندلس ہی کے اندر کہیں پناہ تلاش کرو۔ شہر کے ایک صاحب فہم بزرگ نے اس کے یہ تیور دیکھے تو اسے فہمائش کی کہ اے صاحب بصیرت باپ کے بے بصیرت بیٹے' تیرے دماغ میں یہ کیا سمائی ہے' کیا تو نہیں دیکھتا کہ قرطبہ تو پہلے ہی جا چکا۔ اب اشبیلیہ بھی گیا' اس کے بعد اندلس کے کس شہر میں تاب مزاحمت ہے' باقی ماندہ قرئے پانی کے بلبلے ہیں کہ ان کی بنا پر آب ہے' اب اندلس میں ہمارے لئے کہیں پناہ نہیں' عقل سے کام لے اور ہمارے ساتھ چل کہ ہم نے یہاں سے نکل کر فیض میں پناہ لینے کی نیت باندھی ہے۔

یہ کلام سن کر میرے جد کا جد رویا اور یوں گویا ہوا کہ صبر کی سل سینے پر رکھ کر اشبیلیہ سے تو میں نے کنارہ کر لیا کہ پدر بزرگوار کی

KitaabPoint.blogspot.com

طرف سے یہی اشارہ مجھے ملا تھا' مگر کیا میں اندلس ہی سے منہ موڑ کر نکل جاؤں قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے' اندلس سے یہ بے وفائی مجھ سے نہ ہوگی۔ سوائے بزرگ یہاں سے میری اور اہل اشبیلیہ کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔

یہ کہہ کر میرے جد کے جد نے اپنی الگ راہ لی اور ہرج مرج کھینچتا' رنج سفر سہتا' مالقہ کی بستی میں پہنچا' بس اس زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے' پھر وہ وہیں کا ہو رہا' جلد ہی اس نے اپنا کچا پکا گھر بنا لیا۔ پھر اس نے اس کے صحن میں ایک کھجور کا پیڑ لگایا اور اس کے سائے تلے ایک تخت بچھایا جس پر بیٹھ کر وہ صبح و شام گریہ کیا کرتا تھا۔ میں نے سنا اپنے جد سے کہ روز صبح و شام وہ اشبیلیہ کے در و دیوار کا تذکرہ کرتا اور اس گمشدہ صحن میں لگی کھجور کو یاد کرتا جو اس کی دانست میں کھجوروں کی شہزادی تھی' اور پھر گریہ کرتا۔ اپنی آخری صبح اس نے اس طور کی کہ میرے جد کو قریب بلایا اور دیکھ کر مسکرایا اور میرے جد نے بیان کیا کہ اشبیلیہ سے نکلنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اپنے باپ کے چہرے پر مسرت کی لہر دیکھی' مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے میرے بیٹا یہ وصال کی صبح ہے' میں نے صبح صادق کے طلوع کے ساتھ خواب دیکھا کہ جیسے میں اشبیلیہ گیا ہوں اور اپنے گھر کے صحن میں اپنی کھجور کے سائے میں بیٹھا ہوں اور گربہ سیاہ مجھ سے آ کر گلے ملی ہے یہ کہہ کر میرا باپ مسکرایا اور بولا کہ صبح صادق کا خواب سچا ہوا کرتا ہے۔ یہ کہتے کہتے اس نے ہچکی لی اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

ابن حبیب چپ ہوا۔ پھر تامل کر کے افسردگی کے ساتھ بولا "اے میرے عزیز اب میں اپنے اجداد کی سنت میں اپنے قریے سے اجڑ کر نکلا ہوں اور تیرے شہر میں وارد ہوا ہوں اور میں اپنے اجداد سے بڑھ کر سیہ بخت ہوں۔ ان کے لئے ایک غم تھا' مرے جد کا جد اشبیلیہ کی جدائی کا داغ سینے پر لے کر مالقہ میں وارد ہوا تھا' میرے سینے پر دو داغ ہیں' اشبیلیہ کا غم میرا جدی غم ہے' مالقہ کا غم میرا اپنا غم ہے' اشبیلیہ میں میرے اجداد کی قبریں ہیں' مالقہ میں میری نال گڑی ہے۔ سوائے میرے غمگسار میرے مشفق' میں سینے پر دو داغ لئے تیرے شہر میں بھٹکتا پھرتا ہوں اور یہ میری چشم پر آب ہیں' یہ دونوں میرے لئے عذاب ہیں۔ ایک اشبیلیہ کے لئے اشک بار ہے۔ دوسری مالقہ کے لئے روتی رہتی ہے۔"

یہ کہہ کر ابن حبیب رویا۔ عبداللہ نان فروش کی بھی آنکھ بھیگ گئی۔ اس نے آنسو پونچھے اور یوں کلام کیا کہ "اے اشبیلیہ کے مبارک شہر کی مٹی اور اے مالقہ سے آنے والے' تو نے میرے اس غم کو جو میں نے مدت سے فراموش کر رکھا تھا تازہ کر دیا۔ جان لے کہ ویسے تو میں غرناطہ ہی کا فرزند ہوں کہ میری نال یہاں گڑی ہے مگر میں مٹی ہوں قرطبہ کی۔ میرے اجداد کا جد قرطبہ سے اجڑ کر نکلا تو ہرج مرج کھینچ کر یہاں پہنچا حق یہ ہے کہ غرناطہ نے اس کی بہت دلجوئی کی۔ جس طور ایک ماں پردیس سے واپس آنے والے

KitaabPoint.blogspot.com

اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے آغوش وا کرتی ہے اسی طور غرناطہ نے قرطبہ سے آنے والے اپنے جگر کے ٹکڑے کے لئے آغوش وا کی۔ مگر اس شہر کی یہ شفقت میرے جدِ اکبر کے غم کا مداوا نہ کر سکی۔ قرطبہ سے جدائی کا غم اسے گھن کی مثال کھاتا رہا۔ سنا میں نے اپنے جد کے جد سے کہ اس جد بزرگ کو ہر پھر کر ایک ہی خواب دکھائی دیتا تھا کہ جیسے وہ قرطبہ گیا ہے اور قرطبہ کی بڑی مسجد اسے دور سے دکھائی دے رہی ہے۔ وہ بیتابی سے اس مسجد کی طرف بڑھتا ہے مگر ابھی رستے میں ہوتا ہے کہ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور ہر بار صبح کو بیٹوں کو جمع کر کے وہ یہ خواب سناتا اور گریہ کرتا اور کہتا کہ اے میرے بیٹو اپنے کم نصیب باپ کے حق میں دعا کرو کہ ایک مرتبہ اسے خواب ایسا نظر آئے کہ وہ مسجد الاعظم کی سیڑھیوں تک پہنچ جائے۔"

یہ بیان کرتے کرتے عبداللہ نان فروش نے زبان کھولی اور یوں بولا کہ "اے جگر پہ دو داغ رکھنے والے' میرا اور تیرا درد مشترک ہے۔ سو جان لے کہ اب تو اس شہر میں اکیلا نہیں ہے۔ سو جس چھت کے نیچے تو بیٹھا ہے اسے اپنی چھت جان۔ اب اس تندور کے پاس بیٹھ کر اپنے قریے کی یادوں کو تازہ کیا کر۔ شاید اس واسطے سے میں بھی اس خوشبو شہر کی یاد تازہ کر سکوں جہاں کی میں مٹی ہوں۔"

یہ کلام سن کر ابن حبیب فرط جذبات سے رو پڑا اور بولا "غرناطہ کی مہمان نوازی کے جو قصے میں سنا کرتا تھا ان کی آج تصدیق ہو گئی۔"

تسپر عبداللہ نان فروش یہ بولا "میرے یار' غرناطہ شہر عجب ہے اور یہ ایام بھی عجب ہیں کہ اجڑ کر آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اندلس کے دور دور کے اجڑتے برباد ہوتے شہروں سے خانہ خراب قافلہ در قافلہ آ رہے ہیں اور غرناطہ میں ڈیرے ڈال رہے ہیں اور اب عالم یہ ہے کہ غرناطہ میں غرناطہ کے فرزند کم نظر آتے ہیں باہر سے آئے خانہ برباد زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔"

ابن حبیب نے زہر خند کیا اور بولا "منجملہ ان کے ایک میں بھی ہوں۔"

"یار جواد مجھے لگتا ہے کہ تم بھی انہیں میں سے ہو۔" میں چونک پڑا یہ آواز بیچ میں سے کہاں سے آ گئی۔ انمل بے جوڑ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ وہ ساری لڑی ہی بکھر گئی۔ بلکہ غائب غلہ ہو گئی۔ اب مجو بھائی کی بات یاد آ رہی تھی۔

"یار مجھے لگتا ہے کہ تم بھی وہیں سے انہیں کے ساتھ نکلے تھے۔ پہلا پڑاؤ تم نے بھی غرناطہ ہی میں کیا تھا یا شاید اب بھی وہیں ڈیرے ڈالے پڑے ہو۔ یار بہت ہو گئی' نکل آؤ وہاں سے۔" مجو بھائی ہنسے۔

میں واقعی سوچ میں پڑ گیا۔ کیا واقعی؟ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے یہی وہ بات ہو جو میں بھول گیا تھا۔ سوچتا رہا' یاد کرتا رہا' یہ دھیان دیئے بغیر کہ مجو بھائی نے یہ بات کس لہجہ میں کہی تھی۔ خیر بہت یاد کیا۔ کچھ یاد نہیں آیا۔ پھر اپنی حماقت پہ ہنسا۔ مجو بھائی تو اپنی

KitaabPoint.blogspot.com

ہانکتے رہتے ہیں۔تم عجب ہو کہ ان کی بات پہ سنجیدہ ہو گئے۔اس احساس کے باوجود سنجیدگی اپنی جگہ برقرار رہی۔جب کچھ یاد نہ آیا تو اور افسوس ہوا' کہ میں ان میں سے نہیں ہوں ''نہیں' مجو بھائی' نہیں۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔میں تمہارے والے انبوہ میں سے ہوں۔اسی انبوہ کے ساتھ آیا اور اس شہر بے فیض میں آ کر ڈیرے ڈالے۔''

''پیارے ایسا مت کہو۔یہ شہر بے فیض اب ہوا ہے۔اس وقت بے فیض ہوتا تو تم جھگی ہی میں پڑے گلتے سڑتے رہتے۔''

مجو بھائی نے کیا بات یاد دلائی۔نشانہ تاک کر مارا تھا۔مجھے اپنی جھگی والا زمانہ یاد آ گیا۔وہ قیامت خیز بارش جس نے ان ساری جھگیوں کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔تھوڑا بعد میں آئی۔میں اس وقت تک مجو بھائی کے کوارٹر میں منتقل ہو چکا تھا' نہیں تو میری بھی چارپائی معہ ایک عدد کھیس اور دری کے ریلے میں بہتی نظر آتی۔اس زمانے میں تو جھگیوں کو دیکھ کر عبرت ہوتی تھی کہ کیسے کیسے مکانوں کے مکین دم کے دم میں جھگی نشین بن گئے۔مگر اب مجھے یوں لگتا تھا کہ پاکستان کا یا کم از کم کراچی کا سنہری زمانہ وہی جھگیوں کا زمانہ تھا۔ویسے تو یوں بھی اس دور کا اندازہ لگا جا سکتا ہے۔کہ اس زمانے میں یہاں نہ نقاب پوش دکھائی دیتے تھے نہ کلاشنکوف والے' نہ دن دہاڑے کاریں چھیننے والے' خیر اس زمانے میں کاریں یاروں کے پاس تھیں بھی کہاں۔پاس نہ مال و اسباب تھا' نہ طبل و علم' نہ سواری باد بہاری۔زمانہ خلاف ہو کے کیا لیتا اور چھیننے والا کیا چھینتا۔سرمایہ لے دے کے یادوں کا تھا۔اصل میں میں اس وقت اسی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔یادیں ان دنوں کے پاس بہت تھیں۔دامن بھرے ہوئے تھے۔پڑے ہیں جھگیوں میں' خیالوں میں بسے ہوئے ہیں اونچے بام و در۔باتیں لال قلعہ کی' پسرے ہوئے ہیں لالو کھیت میں۔مگر یہ دور جلدی گزر گیا۔جلدی جھگی نشین بالا نشین بن گئے۔پھر وہ اہل سرمایہ میں شمار ہوئے۔یادوں کا سرمایہ میرے نام لکھا گیا۔اسی نسبت سے طعنے بھی حصے میں آئے۔طعنے' طنز' تعریض' تمسخر۔

''جواد بھائی' معاف کیجئے آپ میرٹھ کیا لینے گئے تھے؟''

''جی؟'' میں نے حیران ہو کر توصیف کو دیکھا۔مجھے احساس ہوا کہ بیوروکریسی کا پرزہ یا اختری باجی کے لفظوں میں ضلع کا حاکم بننے کے بعد توصیف کا لہجہ کچھ بدل گیا ہے' اور شاید نظر انداز نظر بھی۔

''دیکھئے جواد بھائی' اس روز ہم نے آپ کو نو چندی کے پراٹھے بھی کھلوا دیئے اور خیر نگر کے سیخ کباب بھی۔اور ہم جیسے خاکسار بھی یہیں ہیں۔ادھر رہ کیا گیا۔''

''بس تمہارے خیرل بھائی اور ان کی بلی۔'' مجو بھائی نے ٹکڑا لگایا۔

KitaabPoint.blogspot.com

توصیف نے ایک پرتکلف قہقہہ لگایا۔ پھر بولا ''میں ایک دفعہ گیا تھا میرٹھ۔ کوٹلہ کا باجی کسی زمانے میں بہت ذکر کیا کرتی تھیں۔ وہاں الو بول رہا تھا۔ کچھ بڈھے ٹھڈے دکھائی دیئے۔ لگتا تھا کہ پچھلی صدی کے لوگ ہیں۔ خیرل بھائی اپنی بیٹھک میں ٹوٹروٹوں بیٹھے تھے۔ بہت پتلا حال تھا موصوف کا۔ مجھے ان پہ بہت رحم آیا۔ پاکستان آ جاتے تو ان کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جاتا۔''

''کیسے آ جاتا۔'' اختری باجی بولیں ''عقل پہ جو پتھر پڑے ہوئے تھے۔ رشتہ داری تو خیر ہماری دور کی تھی۔ مگر محلہ داری کا رشتہ تو تھا۔ اماں نے بہت سمجھایا تھا کہ بیٹا خیرل یاں اب کیا رکھا ہے۔ یاں رہ کے کیا جوتیاں گانٹھو گے۔ پاکستان چلے چلو۔ مگر اس کے تو دماغ میں فتور تھا۔ نہیں مانا۔ اپنی تقدیر پھوڑلی' ماں باپ نے کن مصیبتوں سے پڑھایا لکھایا تھا۔ سب اکارت گیا۔''

''مجو بھائی' میں تو دو دن میں وہاں بور ہو گیا۔ ایک تو میں اپنے ان بزرگوں کے ہاتھ روم سے تنگ تھا۔ کمال ہے' وہاں کھڈیاں اب تک چل رہی ہیں۔''

''رحم آتا ہے ان لوگوں پہ۔'' اختری باجی نے توصیف کے بیان میں اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ ''اب واں رکھا کیا ہے۔ رونق تو سچی بات ہے ہمارے دم سے تھی۔ اب واں کون ہے۔ ایرا غیرا ہی رہ گئے ہیں۔ تیلی تنبولی' بھٹیارے گھسیارے گھسیارے یا خیرل جیسے نکھٹو' میں تو سچی بات ہے خالو کے مرنے پہ خالہ اماں کے منہ سے چلی گئی تھی۔ چار دن میں بولا گئی۔ چالیسواں کرتے ہی واں سے نکل کھڑی ہوئی۔''

اور مجو بھائی کس مزے سے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

''مجو بھائی۔'' بشو بھابی کہنے لگیں ''ہم بڑا بول نہیں بولتے۔ مگر سچی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ نگوڑے لکھنو کی ناک تو ہمارا خاندان تھا۔ ہمارے آنے کے بعد تو واں خاک اڑتی ہے۔''

''عالی جاہ۔'' آقا حسن کہنے لگے ''اب تو اس دیار کو یاد کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ ہمارا غریب خانہ' میاں یقین جانا' پورا محل تھا۔ اب اس کے نام ایک کھنڈر کھڑا ہے۔ تو قبلہ آپ منصفی کریں' کس واسطے سے اب ہم اس اجڑے دیار کو یاد کریں۔''

مجھے 'دلکشا' کی یاد آ گئی۔ واں دلکشا کی جگہ اب ملبہ پڑا تھا۔ عمارت کے نام ایک زینہ رہ گیا تھا۔ وہ بھی خستہ وشکستہ' عجب بات ہے۔ زلزلہ بیشک پوری عمارت کو ہلا ڈالے' زینے کو کچھ نہیں کہتا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ زلزلہ آئے تو زینے کے نیچے پناہ لو۔ محفوظ رہو گے۔ تو بس دلکشا کے نام ایک خستہ وشکستہ زینہ رہ گیا تھا۔ اس خستہ وشکستہ زینے نے ''دلکشا'' کے گزرے دنوں کو میرے اندر زندہ کر دیا۔ اب میں اس زینے کو اپنے اندر لئے پھر رہا تھا۔ اور ہاں وہ حویلی کی خستہ حال کاہی آلود دیوار۔ پتہ نہیں کاہی لگی دیوار میں کیا کچھ